سید عاشور کاظمی: اجالے یادوں کے

دن کون سا تھا؟ تاریخ کیا تھی؟ کچھ یاد نہیں لیکن 1993 میں نومبر کی ایک شام تھی۔ میں ایک تقریب میں گیا ہوا تھا۔ میں کنارے کھڑا تھا اور میری آنکھیں کسی جاننے والے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اچانک میری نظر ایک دوست پر پڑی اور میں اس کی طرف بڑھا۔ سلام وکلام کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ خوبصورت سوٹ میں ملبوس، چہرہ گورا اور چوڑا، سر کے زیادہ تر بال سفید، آنکھوں میں موٹے گلاس والا چشمہ پہنے ایک صاحب میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں بھی ان کی طرف دیکھنے لگا کہ اس دوست نے ان سے مخاطب ہو کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''بھائی جان یہی عقیل ہے۔'' بھائی جان کا لفظ سنتے ہی میں پہچان گیا کہ یہ برطانیہ کے معروف ادیب سید عاشور کاظمی ہیں۔ خوشی سے ان کا چہرہ کھلنے لگا۔ میرے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ تیزی سے وہ میری طرف اور میں ان کی طرف بڑھا۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ میرے کان میں کہنے لگے لندن میں تمہاری باتیں اکثر ہوا کرتی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ان سے اتنی باتیں ہوئیں کہ مجھے لگنے لگا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں اور مدتوں بعد ملے ہوں۔ حالانکہ چند مہینے پہلے ہی ہم دونوں ایک دوسرے سے غائبانہ طور پر متعارف ہوئے تھے۔

تقریب اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی سردی بھی تیز ہوگئی تھی اس لئے میں نے ان سے رخصت ہونے کی اجازت مانگی۔ کہنے لگے کل پھر آنا، اور بھی باتیں کرنی ہیں۔ میں دوسرے دن پھر ان سے ملا۔ اس ان سے دیر تک باتیں ہوئیں۔ عاشور کاظمی کے متعلق پہلے سے جتنا میں جانتا یا سنا کرتا تھا اسے مدنظر رکھتے ہوئے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھ جیسے معمولی طالب علم سے وہ اس قدر خلوص ومحبت سے ملیں گے اور اتنی باتیں کریں گے۔ عاشور کاظمی سے ملاقاتوں اور باتوں کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ وہ تقریباً ہر سال ہندوستان آتے تھے۔ یہاں جیسے ہی وہ آتے تھے تو راشٹریہ سہارا میں خبر شائع ہوتی کہ لندن کے معروف ادیب سید عاشور کاظمی دہلی میں موجود ہیں۔ بس اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ان کی شان میں جلسے منعقد ہونے لگتے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ان کے انٹرویوز بھی لیے جاتے۔ یہاں آتے ہی خاص طور سے مجھے فون کرتے اور اپنے آنے کی خبر دیتے اور پوچھتے کہ کب مل رہے ہو۔ میں بھی ان سے ملنے کے لیے فوراً چلا جاتا۔ ان سے مل کر دہلی میں ان کے قیام و پروگرام کے متعلق باتیں ہوتیں۔ دہلی میں اپنے قیام کے دوران اکثر مقامات پر وہ میرے ساتھ جانا پسند کرتے تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ کہیں جانے میں خوشی محسوس ہوتی۔ اس طرح مجھے ان کے قریب آنے اور ان کے متعلق جاننے کا موقع ملا۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو میں نے قریب سے دیکھا، پہچانا، مشاہدہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ جتنے بڑے دولت مند تاجر تھے اس سے کہیں زیادہ بڑے انسان تھے۔ اپنے نجی ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا شخص زمین سے جڑا ہوا انسان تھا۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ایک روز تقریباً دو بجے وہ میرے ساتھ دہلی یونیورسٹی میں تھے اور مجھے بھوک لگی ہوئی تھی، میں چھولے اور کُلچے کھانا چاہتا تھا۔ میں نے اخلاقاً ان سے چھولے اور کُلچے کھانے کے لیے کہا اور وہ تیار ہو گئے۔ ہم دونوں نے وہیں فُٹ پاتھ پر بیٹھ کر چھولے کُلچے کھائے۔ بعد میں سوچتا رہا کہ انہیں چھولے اور کُلچے کھلا کر کہیں میں نے ان کی شان میں کوئی گستاخی تو نہیں کی۔ اس لئے دوسرے دن میں نے اس گستاخی کے لیے ان سے معذرت پیش کی تو کہنے لگے ''میاں اتنی خلوص، محبت اور معصومیت کے ساتھ کوئی زہر بھی کھلائے تو میں کہیں بھی بیٹھ کر کھا لونگا۔ ان کی خاکساری کی مثالیں اور بھی ہیں۔ مثلاً وہ

ہندوستان اکثر جولائی کے مہینہ میں آتے تھے۔ اس مہینہ میں اُمس بھری گرمی اپنے شباب پر رہتی ہے۔ وہ دہلی کے جس علاقہ میں رہتے تھے اس علاقہ میں اگر بارش ہوتی ہے تو وہاں کی پتلی پتلی گلیاں پانی اور کیچڑ سے بھر جاتی ہیں۔ اُوپر سے ٹھیلے والے، رکشا والے، اور کبھی کبھی گدھے اور دوسرے جانور بھی انہیں گلیوں سے گزرتے رہتے ہیں جس سے آنے جانے والے سفید پوش انسانوں کا حلیا بدل جاتا ہے اور کئی بار انہیں پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی کئی بار اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا تھا لیکن عاشور کاظمی کو ان گلیوں سے گزرنے میں ذرا بھی چہرے پر شکن نہیں آتی تھی۔ میں اکثر یہ سوچتا کہ کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں عاشور کاظمی صاحب کہ لندن کی صاف شفاف اور حسین وادیوں میں رہنے کے عادی ہونے کے باوجود کس طرح ان گندی گلیوں سے گزرتے ہیں۔ انہیں تو دہلی کے کسی پانچ ستارہ ہوٹل میں ٹھہرنا چاہئے جہاں کار پارکنگ ہوتی ہے، خوشگوار موڈ میں بیٹھ کر باتیں کرنے کے لیے ائیر کنڈیشن لانج ہوتی ہے۔ وہاں رہنے میں نہ انہیں کوئی پریشانی ہوتی نہ ان سے ملنے والوں کو آنے جانے میں پرانی دہلی کی گلیوں کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس لئے مجھ سے رہا نہیں گیا اور ایک دن میں نے اپنے دل کی بات ان سے کہہ دی۔ وہ کہنے لگے کہ عقیل میاں پرانی دہلی اور یہاں کی گلیوں میں رہنے والوں میں جو اپنا پن، خلوص اور محبت ہے وہ پانچ ستارہ ہوٹل میں کہاں ملے گا۔ دوسری بات یہ کہ پانچ ستارہ ہوٹل میں مجھ سے ملنے کے لیے تم تو آسکتے ہو لیکن پرانی دہلی یا جمنا پار کے علاقے کی گلیوں میں رہنے والے عام انسان جو کسی نہ کسی روپ میں اردو سے جڑے ہوئے ہیں یہاں نہیں آپائیں گے۔ میں تو دراصل ان سے ملنے آتا ہوں جو اردو کے سچے سپاہی ہیں اور سپاہی تو عام انسان ہی ہوتے ہیں۔ الغرض وہ ایک ایسے انسان تھے جنہیں فرانس اور پیرس کی بنی پرفیوم سے زیادہ ہندوپاک کی مٹّی کی خوشبو، بڑے بڑے محلوں اور پانچ ستارہ ہوٹلوں سے زیادہ اپنوں کے گھر پسند تھے۔ تبھی تو ساری دنیا جرمن، فرنچ اور انگلش کی دیوانی ہے لیکن وہ اردو اور اردو والوں کے دیوانے تھے۔ الغرض وہ ایک ایسے انسان تھے جنہیں فرانس اور پیرس کی بنی پرفیوم سے زیادہ ہندوپاک کی مٹّی کی خوشبو، بڑے بڑے محلوں اور پانچ ستارہ ہوٹلوں سے زیادہ اپنوں کے گھر پسند تھے۔ تبھی تو ساری دنیا جرمن، فرنچ اور انگلش کی دیوانی ہے لیکن وہ اردو اور اردو والوں کے دیوانے تھے۔

سید عاشور کاظمی مجھے اپنا چھوٹا بھائی مانتے تھے اور بچہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کے دماغ میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ میں ان کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی تصنیفات پر اظہار خیال بھی کر سکتا ہوں۔ اس لئے انہوں نے کبھی مجھ سے کچھ لکھنے کی فرمائش نہیں کی ورنہ زیادہ تر دوسرے ملکوں کے شاعر و ادیب یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ سے مضمون لکھنے کی فرمائش ضرور کرتے ہیں۔ ایک دفعہ وہ دہلی آئے ہوئے تھے اور ان ایک کتاب 'اردو مرثیے کا سفر (سولہویں صدی سے بیسویں صدی تک) اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار'' شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی رسم اجرا ایک ہفتہ بعد ہونے والی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح مجھے فون کیا کہ میں آچکا ہوں، تم کب آؤ گے؟ میں نے کہا کہ ایک گھنٹہ میں۔ تھوڑی دیر بعد جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے اپنی نئی کتاب دی اور کہا کہ اس کی رسم اجرا ایک ہفتہ بعد اردو گھر میں ہوگی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم اس پر کچھ لکھ کر رسم اجرا کی تقریب میں پڑھ سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں کوشش کروں گا لیکن اس موضوع پر میں نے نہ کبھی کچھ پڑھا ہے اور نہ کبھی کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں تم کوشش کرو اور ایک دو دن پہلے لکھ کر لانا میں دیکھ لونگا۔ پانچویں دن ایک مضمون ''سید عاشور کاظمی اور مرثیہ کا تجدیدی سفر'' کے عنوان سے لکھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا یہ سوچتے ہوئے کہ اتنی جلدی میں لکھا ہے نہ جانے انہیں پسند آئیگا یا نہیں۔ وہ مضمون پڑھنے لگے اور میں ان کا چہرا۔ تھوڑی دیر میں ان کے چہرے پر مرتب ہوتے ہوئے تاثرات، آنکھوں میں پیدا ہوتی ہوئی چمک اور ان کے بدن کے لسان کو دیکھ کر میں مطمئن ہوا کہ یہ مضمون نہ صرف انہیں پسند آرہا ہے بلکہ وہ کچھ خود پر اور کچھ مجھ پر فخر محسوس کر رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ جسے میں صرف چھوٹا بھائی اور بچہ سمجھتا تھا وہ ایک مقالہ نگار نکلا۔ اس دن عاشور کاظمی صاحب نے مجھے دل سے دعائیں دیں اور کئی بار کہا کہ'' بھائی مان گیا تم ایک اچھے مقالہ نگار ہو۔'' کسی وجہ سے انہیں فوراً لندن واپس جانا پڑا اور اجرا کی تقریب ملتوی ہو گئی۔ اس کتاب کے سلسلے میں میں نے پاکستان کے ایک ادیب سلطان جمیل نسیم (جو صبا اکبرآبادی کے بیٹے بھی ہیں) سے ذکر کیا اور کہا کہ اس میں آپ کے والد کی مرثیہ نگاری پر عاشور کاظمی نے اچھا تبصرہ کیا ہے جسے میں نے اپنے مضمون میں بھی کوٹ کیا ہے تو انہوں نے مضمون پڑھنے کی خواہش ظاہر کی اس لیے میں نے اسے ای میل کے ذریعہ پاکستان ان کے پاس بھیج دیا۔ اسے پڑھنے کے بعد انہوں نے اسے شائع کرانے کی اجازت مانگی۔ اس طرح یہ مضمون پاکستان کے ایک رسالہ میں شائع ہوا۔ پاکستان کے ادیبوں نے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد عاشور کاظمی کو فون کیا اس مضمون کی تعریف کی۔ اس

کے بعد انہوں نے فوراً مجھے فون کیا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ اس کتاب کی رونمائی دوسرے سال اردو گھر میں ہوئی۔ کئی لوگوں نے اس کتاب پر اظہار خیال کیا اور مقالے بھی پڑھے۔ میرے مقالہ کے متعلق منتظمین کو کوئی جانکاری نہیں تھی اس لیے مجھے نہ مقالہ پڑھنے کے لئے کہا گیا اور نہ میں خود پڑھنے کی پیش کش کی۔ مقالہ نہیں پڑھنے کا مجھے بھی افسوس تھا اور انہیں بھی۔ میں نے سوچا تھا کہ آئندہ جب آئیں گے تو ان کی شان میں ایک چھوٹا سا جلسہ اپنے کالج میں کروں گا اور یہ مقالہ وہیں پڑھونگا لیکن ہندوستان کا وہ سفر ان کا آخری سفر تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان کے اس آخری سفر سے پہلے ان کی شان میں ایک پروگرام اپنے کالج میں کر چکا تھا۔

دراصل عاشور کاظمی کو اسکول اور کالج کے اردو پڑھنے والے طالب علموں سے اردو کے سنہرے مستقبل کی بہت امیدیں وابستہ تھیں۔ اس لیے اسکول اور کالج کے طلبہ سے ملنے کا انہیں بڑا شوق تھا تاکہ انہیں اردو پڑھنے اور سیکھنے کے لئے مائل کیا جا سکے۔ اسی لئے ایک دفعہ جب وہ دہلی تشریف لائے ہوئے تھے تو اپنے کالج کے طلبہ سے ملوانے کے بہانے میں نے اپنے کالج میں ایک جلسہ منعقد کیا تھا جس کی صدارت ہندی زبان کے بڑے اسکالر ڈاکٹر کرن سنگھ چوہان نے کی تھی۔ اس جلسہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈاکٹر کوثر مظہری، دیال سنگھ کالج سے ڈاکٹر مولا بخش، اردو آفیسر ڈاکٹر اشفاق عارفی اور راشٹریہ سہارا کی طرف سے ڈاکٹر مشتاق صدف نے ان کی تخلیقات پر اظہار خیال کیا تھا۔ آخر میں سید عاشور کاظمی نے برطانیہ میں اردو کی صورت حال پر تقریر کی اور یہ بھی بتایا کہ وہ خود اردو کی ترقی کے لئے برطانیہ میں کیا کیا کر رہے ہیں۔ آخر میں طلبہ ان سے سوالات پوچھنے لگے اور وہ ان کے سوالوں کے جواب گھنٹوں دیتے رہے۔ چند گھنٹوں کی ملاقات میں طلبہ ان سے اتنے گھل مل گئے کہ کئی سالوں تک انہیں یاد کرتے رہے۔ اس جلسہ میں نجی ٹی وی چینل کے لیے فلمیں اور پروگرام بنانے والی ایجنسی کے ایک سربراہ بھی موجود تھے۔ عاشور کاظمی کی تقریر سے متاثر ہو کر مجھ سے ان کا انٹرویو لینے کے لیے کہا گیا۔ انٹرویو لینے کے لیے ایک ہفتہ تک میں نے ان کی بیشتر کتابوں کا مطالعہ کیا اور ایک سوال نامہ تیار کیا۔ اس کے بعد انہیں اپنے گھر لے کر آیا۔ یہیں کیمرا مین اور لائٹ مین بھی آ گئے تھے۔ کوئی تین گھنٹے تک میں نے ان کا انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے حالات زندگی، ادب اور زندگی کے متعلق نظریات کے سلسلے میں کافی روشنی ڈالی تھی۔ اس انٹرویو کے بعد میں ان کی شخصیت اور ان کی تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں کا مزید قائل ہوا۔ اس انٹرویو سے ملی جانکاری کے مطابق ان کی پیدائش پانی پت کے ایک بستی فرید پور میں 10 فروری 1933ء میں ہوئی تھی۔ اسی دن یومِ عاشورہ بھی تھا اس لئے ان کا نام عاشور علی کاظمی رکھا گیا۔ ان کے والد محترم سید زوار حسین کاظمی اور والدہ محترمہ سیّدہ فاطمہ کا تعلق سادات گھرانے سے تھا۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے دوران وہ اپنے اہلِ خاندان کے ہمراہ جہلم، پاکستان ہجرت کر گئے لیکن جلد ہی وہاں سے لاہور چلے گئے۔ جنرل ایوب خان نے جب مارشل لا نافذ کیا تو وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے اور بُٹیک کا کاروبار شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹکسٹائل انڈسٹری میں انہوں نے بڑا مقام حاصل کر لیا۔ لیکن 1976ء میں پاکستان سے برطانیہ چلے گئے جہاں انہوں نے تجارت کا آغاز تو ایک ٹریول ایجنسی سے کیا لیکن جلد ہی ایک کارگو جہاز خرید لیا اور کارگو کے کاروبار کو فروغ دینے میں مصروف ہو گئے اور جلد ہی ان کا شمار بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا لیکن حیرت کی بات ہے کہ وہ خود سرمایہ دار ہونے کے باوجود سرمایہ داری کے خلاف تھے۔ دراصل ان کا تعلق ایک ایسے خاندان اور ماحول سے تھا جہاں انہوں نے بچپن سے حضرت امام حسینؑ اور ان کے اہلِ خاندان کی قربانیوں کی داستان سنی تھی جس کا اثر ان کے دل و دماغ پر گہرا تھا۔ اس لیے ظلم و ستم اور آمریت کے خلاف آواز بلند کرنا، احتجاج کرنا اور حق کی بات کرنا، مظلوموں کی حمایت کرنا ان کی فطرت میں شامل تھی۔ اسی جذبے کے تحت حقوق انسانی کی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے اور لندن میں رہ کر ایشیا، افریقہ اور یوروپ جیسے ملکوں میں مظلوموں کی حمایت کرتے رہے۔

اپنی عمر کے کل 34 سال یوروپ میں گزارنے کے بعد بھی ہندوستانی تہذیب اور یہاں کی محبوب ترین زبان اردو سے محبت کرتے رہے اور یوروپ میں اردو کے علم بلند رکھنے کے لئے اپنا تن من اور دھن لٹاتے رہے۔ 1985ء میں انہوں نے لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس منعقد کیا جس میں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں نے حصہ لیا اور سبھی ان کی علمی لیاقت اور تنظیمی صلاحیت سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد دنیا بھر میں اردو کے کانفرنسوں اور سیمیناروں میں وہ بلائے جانے لگے جس سے ہر خاص و عام ان کی ادبی صلاحیتوں سے متعارف ہونے لگا۔ زبان و ادب

اور ادیبوں سے ان کی بے پناہ محبت کے چرچے چاروں طرف ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ کارگو کے کاروبار کو ترک کر کے خود کو ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ برطانیہ میں انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر قائم کیا اور اس ادارہ کے ذریعہ ادیبوں، اردو اداروں اور مختلف ادبی پروجکٹوں کو مالی تعاون دیتے رہے۔ اس کے علاوہ اس ادارے نے پچاس سے زیادہ کتابوں کی نشر و اشاعت کی۔ انہوں نے بھی برطانیہ میں اردو یونیورسٹی کھولنے کی کوشش شروع کر دی تھی لیکن وقت اور حالات نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ان کی پوری کی پوری توجہ برطانیہ کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم کی طرف تھی۔ یہ برطانیہ میں اردو کے فروغ کا بنیادی کام تھا۔ اردو کے بنیادی کاموں اور اردو والوں پر انہوں نے جتنے پیسے وقت صرف کئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو کے ایک سچے سپاہی تھے۔ اگر وہ چاہتے تو ان پیسوں سے ہندوستان اور پاکستان میں مختلف موضوعات پر سیکڑوں سمینار کرا سکتے تھے اور ان سمیناروں میں پڑھے گئے مضامین کو ایڈیٹ کر کے شائع کرا سکتے تھے اور سیکڑوں کتابوں کے مصنف بن سکتے تھے لیکن انہوں نے نام نہاد صف اوّل کے دانشوروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرانے کے بجائے اردو کا ایک سپاہی بننا بہتر سمجھا۔

سید عاشور کاظمی جب ہندوستان آتے تھے تو اردو کے نام پر پیسے ایسے لٹاتے ہوئے چلتے تھے جیسے اردو والوں کے لئے کوئی چلتے پھرتے بینک ہوں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک دن میں ان کے ساتھ اُوکھلا کے Objective Centre کے آفس سے واپس اردو گھر آ رہا تھا لیکن راستے میں انہوں نے ایرانی سفارت خانہ کی طرف گاڑی لے چلنے کے لیے کہا۔ میں نے سوچا ایران کے سفارت خانہ میں انہیں سفیر سے ملنا ہوگا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اسی بہانے ایرانی سفارت خانہ دیکھنے کا موقع ملے گا۔ سفارت خانہ کے دروازہ پر پہنچ کر انہوں نے فون کیا اور ایک نوجوان جو شکل اور لباس سے سیکوریٹی کا آدمی لگ رہا تھا، سکنڈوں میں باہر نکلا۔ گیٹ کے باہر کھڑے کھڑے پانچ منٹ تک باتیں کیں، اس کے بعد عاشور کاظمی صاحب نے دس ہزار روپے کا ایک چیک کاٹ کر انہیں دے دیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ان سے میں نے پوچھا کہ وہ کون تھا تو کہنے لگے کہ میں بھی اسے نہیں جانتا ہوں لیکن اس نے مجھے فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ سیلم پور کے علاقہ میں کوئی ادارہ چلاتے ہیں جس میں مسلم بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی لئے میں ان سے یہاں ملنے آیا گیا۔ ایسے نہ جانے کتنے ضرورت مندوں کی مدد انہوں نے کی ہوگی۔ ہندوستان کے بڑے اداروں اور معزز شخصیتوں کو بھی انہوں نے ہر طرح سے نوازا تھا۔ ان پر لاکھوں روپے خرچ کیے تھے لیکن ان میں بعض حضرات نے انہیں نقصان پہنچایا تھا لیکن جب بھی ان لوگوں سے ملتے تو ایسے ملتے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ وہ عاشقانِ اہلِ بیعت میں سے تھے اور وہ حضرت علیؑ کے اس قول سے بخوبی واقف تھے کہ جس کی مدد کرو اس کے شر سے بچو، لیکن وہ ایک شریف النفس انسان تھے اور امام غزالیؒ کے اس قول پر عمل کرتے تھے کہ ''دشمنوں کو معاف کر دینا انتقام لینے کا سب سے بہتر طریقہ ہے''۔ دہلی میں ان کے سچے دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی لیکن میری معلومات کے مطابق ڈاکٹر خلیق انجم ان کے بے حد عزیز دوست اور مربی تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت انہیں کے ساتھ اردو گھر میں گزرتا تھا۔ زندگی کے آخری ایّام میں دونوں نے ایک دوسرے کو بہت یاد کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ پچھلے دنوں خلیق انجم صاحب سے جب بھی میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے عاشور کاظمی صاحب کی خیریت دریافت کی اور ان کے متعلق باتیں کی۔ ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران سید عاشور کاظمی پٹنہ ضرور جاتے تھے۔ وہاں کے ادیبوں سے بھی انہیں محبت تھی۔

سید عاشور کاظمی کی فراخ دلی نے ان کی ادبی شبیہ کو دبا دیا تھا۔ کیوں کہ ہند و پاک کے بیشتر اردو والے انہیں یا تو ATM مشین سمجھتے تھے یا یوروپ کی سیر کرانے والا کسی اساطیری داستان کا اُڑن کھٹولہ۔ اس لیے ان کی تخلیقی و تحقیقی اہمیت کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ ویسے بھی بیشتر اردو والوں کی عجیب و غریب سائیکی ہوتی ہے۔ اردو والے انہیں شاعروں اور ادیبوں کو پڑھتے ہیں، واہ واہ کرتے ہیں اور سر دھنتے ہیں جنہوں نے نکمّوں کی طرح کسی دیوار کے سائے تلے پڑے پڑے زندگی گزار دی ہو یا عشق کے جنون میں محبوب روشنی کی صورت میں آسمان سے زمین کی طرف آتی ہوئی دکھائی دیتی ہو پھر مالی تنگی سے تنگ آ کر روٹی کے بجائے کپڑے چبائے ہوں یا اپنے گھر میں جوئے کھلائے ہوں۔ لیکن آج بھوکے ننگے ادیبوں اور شاعروں کا وجود ختم ہو گیا ہے۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے زیادہ تر پھٹے حال اور پھٹیچر قسم کے لوگ شاعر و ادیب ہوا کرتے تھے لیکن اب Multimillionaire تاجر اور اعلیٰ عہدوں پر فائز حضرات بھی اچھے شاعر و ادیب ہیں۔ ان کی تخلیقات میں بھی دم ہے جنہیں پڑھنے اور ان پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ سید عاشور

کاظمی بھی انہیں ادیبوں اور شاعروں میں سے تھے جنہیں خدا نے دولت اور علم سے نوازا تھا۔ انہوں نے اردو ادیبوں کے بھوکے ننگے شبیہ بدل دیا تھا اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ دولت مند اور Elite Class کے لوگ بھی بڑے شاعر و ادیب ہو سکتے ہیں۔

سید عاشور کاظمی کے تعلیمی سفر پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی لیکن اسکول کی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول روہتک (ہندوستان) اور اسلامیہ ہائی اسکول جہلم سے جبکہ بی۔اے کی تعلیم زمیندار کالج گجرات اور ایم اے کی تعلیم اورینٹل کالج لاہور سے حاصل کی۔ بچپن سے انہیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ گھر کا ماحول بھی مطالعہ کے لئے سازگار تھا۔ اسی لئے انہوں نے بچپن ہی سے تخلیق و تحقیق کا کام شروع کر دیا تھا۔ ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا انہوں نے صرف اردو ادب کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں بلکہ مختلف علوم و فنون سے متعلق بے شمار کتابیں انہیں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے لندن تک زندگی کے سفر میں نہ جانے انہیں کتنے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ زندگی کے ان پُر پیچ راہوں نے بھی انہیں بہت کچھ سکھایا۔ ان سب کا انعکاس ان کی تخلیقات میں موجود ہے۔

ان کی شعری تخلیقات میں تین کتابیں ہیں جن میں پہلی ''حرف حرف جنوں'' ان کا حالیہ شائع شدہ مجموعۂ کلام ہے جس میں بہترین غزلیں شامل ہیں۔ دوسری اور تیسری کتاب ''چراغ منزل'' اور ''صراطِ منزل'' ہیں۔ ان میں عقیدت اور محبت کے جذبے سے سرشار، حمد، نعت، منقبت اور سلام کے اشعار ہیں۔ ان کی نثری تخلیقات میں ''راہوں کے خُم'' افسانوں کا مجموعہ ہے جبکہ ''سخن گسترانہ'' اور ''چھیڑ خوباں سے'' طنز و مزاح، انشائیے، خاکے اور مضامین کے مجموعے ہیں۔ ''فسانہ کہیں جسے'' افسانے پر تحقیقی نوعیت کی کتاب ہے جس میں دو ہزار قبل مسیح سے حال تک یوروپ، جنوبی امریکہ اور روس کے عہد ساز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے حوالے سے افسانے کے عروج و زوال پر بحث اردو افسانے کی دونوں روایتوں کے تناظر میں مغرب میں مقیم انتالیس افسانہ نگاروں کا تنقیدی تعارف ایک ایک افسانے کی روشنی میں کرایا گیا ہے۔ ''مرثیہ نظم کی اصناف میں'' جدید مرثیے کی تاریخ پر تحقیقی کتاب ہے جس کا مطالعہ مرثیہ پر کام کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہے۔ ہندستان میں میر انیس و دبیر اور مرثیہ پر لکھے جانے والے اکثر مضامین میں انہیں کوٹ کیا جاتا ہے۔ ''ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر'' مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس میں پچھلے پچاس سالوں میں تخلیق ہونے والے ترقی پسند ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ''بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں''۔ اس کتاب میں مغربی دنیا کے تمام فکشن نگار، مزاح نگار، محقق، ناقد، تاریخ گو، رپورتاژ نگار، صحافت نگار وغیرہ کا تنقیدی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ''بیسویں صدی کے اردو اخبارات و رسائل مغربی دنیا میں'' اس کتاب میں مغربی دنیا کے تمام رسائل، جرائد اور اخبارات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ''اس گھر کو آگ لگ گئی'' دراصل جدوجہد آزادی کے تناظر میں غداروں کے خطوط پر مشتمل دستاویز ہے۔ ''راگ رنگ'' میں انہوں نے موسیقی کی تاریخ اور فنی تجزیات، لغتِ موسیقی اور اوزان موسیقی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ ''نکاتِ فن'' اور انگریزی تالیف "committment" اس میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کے موقع پر پیش کیے گئے انگریزی زبان میں مقالے اور کچھ اہم اردو مقالوں کا انگریزی میں ترجمے شامل ہیں۔ عاشور کاظمی کی تازہ ترین کتاب پہلی نظر میں مرثیے کی مکمل تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کتاب کے مندرجات کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ مرثیے کی مکمل تاریخ سے آگے کی چیز ہے اور اس کا نام ''اردو مرثیے کا سفر (سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک) اور بیسویں صدی کے اردو مرثیہ نگار'' کے بجائے Encyclopedia of Marsia ہونا چاہئے۔ اس کتاب کو مرثیے کی مکمل تاریخ بھی مان لیا جائے تب بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی کیوں کہ مرثیے کی تاریخ پر اب تک کوئی دوسری ایسی وقیع اور مستند کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت مرثیہ گو شاعرات، غیر مسلم مرثیہ نگار اور مغرب میں آباد اردو مرثیہ گو شعراء کی شمولیت ہے۔ آج سے پہلے مرثیہ گو شاعرات اور مغرب میں موجود مرثیہ گو شاعروں پر اس قدر جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ نہیں لکھا گیا۔ گنے چنے غیر مسلم مرثیہ نگاروں کا ذکر تو کہیں کہیں مل جاتا ہے لیکن غیر مسلم مرثیہ گو شاعروں کا مکمل تجزیہ و تعارف پہلی بار اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کی تاریخِ مراثی اردو ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب تحقیق و تنقید کے عروج کی مثال بھی ہے۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ہندستان اور پاکستان کے یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں۔ ان کی شخصیت اورادبی خدمات پر دوکتابیں ''سید عاشور کاظمی: فنکار اور فن'' اور عاشور کاظمی: دانشور اور محرک'' بہار سے شائع ہوچکی ہیں۔ عاشور کاظمی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، ایک فرد نہیں ایک ادارہ تھے۔ آج کے بحرانی حالات میں عاشور کاظمی جیسے صاحب جنوں تحقیق کار اور مجذوب ناقد کی وجہ سے برطانیہ میں اردو کی شمع نہ صرف روشن تھی بلکہ اس شمع سے پوری ادبی کائنات بھی ضیا بار ہورہی تھی اور آج کے اس اردو کُش ماحول میں یہ ضیاباری بھی بہت بڑی بات تھی۔ سید عاشور کاظمی اردو کے سچے عاشق اور جاں نثار تھے۔ دنیا کے شاید وہ ایسے مجاہد اردو تھے جنہوں نے اردو کی خدمت کے لیے کارگوکا کاروبار ترک کردیا تھا اور فروغ اردو کے لیے اپنی زندگی اور دولت وقف کردی تھی لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ پروسٹریٹ کے کینسر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک ہفتہ گھر میں رہتے تھے دوسرے ہفتے ہوسپٹل میں گزارتے تھے۔ پچھلے دو تین سالوں سے ان کی زندگی کا یہی معمول بن گیا تھا۔

6/جون 2010 کو 11 بجے دن میں جب مجھے یہ منحوس خبر ملی کہ سید عاشور کاظمی آج صبح چار بج کر ایک منٹ (ہندوستان کے وقت کے مطابق) پر دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے تو میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ چاروں طرف صفِ ماتم بچھ گئی اور میں نے محسوس کیا کہ برطانیہ میں اردو کا سورج غروب ہو گیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں، باتیں اور ملاقاتیں ہمیشہ تازہ رہیں گی۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

Residence: 262-D, Shipra Sun City, Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
Website:people.du.ac.in/~aahmad